

ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 05 No. 01. January-March 2026.Page# 7795-7810
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

Interpretation of Iqbal's Concept of man in the Context of modernity

جدیدیت کے تناظر میں اقبال کے تصورِ انسان کی تعبیر

Dr. Muhammad Anwar Haris
Email: harisanwarmalik@gmail.com
Fazal Abbas Shah
Email: syedfazalabbasbukhari43@gmail.com

ABSTRACT:

The poetic process, fostered by the innovation of modernity, Identifies the internal and external thoughts of human life. One who was not born in the realm of some supernatural world, but rather is connected to the conscious heritage of man. The term modernity has captured the chaos and helplessness of dreams in a changing era, but it has not been able to free the restless human spirituality from the clutches of imperialism progress. The industrial revolution and the growth of the capitalist economy, the world believed that man would be economically, socially, culturally and religiously and spiritually free. However, the devastation of the first world war and the in human treatment of humanity, along with the economic recession disfigured the face of humanity. The colonialism of the bourgeois class and the poverty of the proletariat class raised questions about the imperialist and colonial systems. Thus, in this chaotic world, Iqbal, s poetry became a metaphor for the creative and intellectual evolution of the modern era, thanks to which an attempt has been made to awaken the social identity and freedom of existence of man. Iqbal, s poetry presents three basic motivations for maintaining the concept of man and his existential identity, emphasizing the awakening of self, the preservation of individuality, and the sovereignty of the divine caliphate. By nurturing individuality, Iqbal strives to connect human society with the "consummate". A "consummate" that does not stagnate like inanimate matter, but rather plays a role in re-conquering the universe.

Through his poetry, Iqbal raises a flame whose glow reveals the secrets of lost worlds. Iqbal's poetry instills the magic of self-identify in silent heats and lightless gazes. In this way, a person succeeds in gaining awareness through the stages of self-discovery through his poetry and prose, Iqbal has tried to reject the materialism and secularism of modernity that had turned man into a machine modern scientific inventions and technology had robbed the individual of his spirituality and morality. Man was like a dead body. Through his poetic practice, he sought to revive human spirituality and emphasized the reconstruction of moral value Iqbal, though his poetry and speech has tried to stimulate both intellect and action since of philosophical interpretations but is tool for improving life. Therefore, Iqbal wants man to evaluate his self in this modern mechanized age, to be filled with love and joy, to understand the laws, of nature, to conquer the universe and to fulfill his right to be the vicegerent of God. According to Iqbal the survival of humanity is possible through the building and development of nations and conquest of the universe. But the systems carved by worldly gods (capitalism bourgeoisie, monarchy, democracy and communism) have taken away man, s freedom. The freedom that nature gave

him through which he could work hard, strive hard. Iqbal believes in human dignity and excellence. He wanted to develop qualities such as courage, board-mindedness, high courage and independence. He became a metaphor for the dawn call to prayer in the darkness of life. Iqbal wanted to give new strength to the dead body of humanity. Therefore, Iqbal has highlighted the perfection of man in his thoughts, poetry and speech. This perfection can only be possible when he plays his role in building his society by developing his faith, independence, firm ideals and self-esteem. In this way, achieving the levels of universality.

Key words:

Selfishness, fulfillmen of humanity, identification, society, communism, monarchy, democracy, patriotism, nationality, brand-mindedness, world of miracles, human dignity, concept of caste, fluid, universal brotherhood. Building humanity, capitalist system, awakening of the soul.

بیسوی صدی کے نوبل انعام برائے ادب(1990ء) رکھنے والے ہسپانوی شاعر اور نقاد اوکٹاویو پاز(1) Octavio Pazنے اُردو شاعری کی جدیدیت کی جمالیاتی تعبیر کے بارے میں اپنی کتاب "The Truth of Poetry" میں لکھا تھا کہ "یہ دو قطبین کی جمودی حالت کے بیچ ایک طرح سے پیدا ہونے والی حرکت جذبات و احساسات کی شستگی ہے جس کا جادوئی عنصر نفسیاتی عنصر میں پیوست ہو کر انسانیت کے فطری پن کو وجودیت سے ہم کنار کر دیتا ہے"۔

انسانی آرزوئیں جن سے اُس کا رشتہ صنعتی انقلابیت نے منقطع کر دیا ہے، اس کی ذات کے داخلی و خارجی عکس کو شعوری سطح پر فطرت کے قریب کر دیتی ہیں۔ انسان کا وجود جو ہر بدلتے زمانے کی تلخیوں سے مسخ ہوتا چلا آرہا ہے جس نے اس کی پہچان کو کرچی کرچی کر رکھا ہے۔ شاعرانہ تعلیق پن اپنی جمالیاتی کشاکش اور فکری وجدان کے طفیل اُس جبلی معصومیت کے وجودی پن کو ایک نیا راستہ فراہم کرتی ہے جس کو ہمارے سماج کا فرد اپنے ذہنی تناؤ، تہذیبی کشمکش، نفسیاتی اضطراب، صنعتی انقلاب کی نارنگیوں اور کامرانیوں کے نشے میں بند کواڑوں کی زینت بنا بیٹھا ہے۔

> انسان کی تہذیبی و تمدنی بالیدگی کی تاریخ کہیں نہ کہیں ایک مرتبہ ضرور کٹھن حالات سے دوچار ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے ہر تہذیب و تمدن کو جب آفاقی شائستگی اور ریاستی پن کی طاقت میسر آتی ہے۔ تو اُس معاشرے کے باشندوں کو بقول ٹائن بی(۲) کے "بیشگی کا سراب" اندھا کر دیتا ہے۔ اسی بیشگی کے سراب کا یقین کامل انہیں معاشرے کی انسانی ساجیت کی آخری صورت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ وہ انسان جو اپنی بلند درجہ صفات کی بنا پر کائنات میں دیگر مخلوقات سے الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی متمائزیت کی وجہ سے انسان کی قوت متخیلہ اور ذہنی شعور تہہ در تہہ پردوں کے باوصف آزاد تصور کی جاتی ہے۔ جو فطرت سے مطابقت رکھتی ہے۔ انسان سماجی اعتبار سے پابندیوں اور آزادیوں کے مابین ایک ایسا مربوط نظام مروج کرتا ہے۔ جو اس کی شدید خواہشات قلبیہ کا ایک مثالی مظہر ثابت ہوتا ہے۔ معاشرہ انسان کو آپس میں رابطہ و ترسیل کا ایک طریقہ کار فراہم کرتا ہے جو فطرت نے اُسے ودیعت کر رکھا ہے۔ مگر تہذیبی ارتقا کی نرماہٹوں، عمرانی نظام کی پیچیدگیوں اور اقتصادی نظام کی بدلتی ہوئی صورتوں نے انسان کا سماجی تشخص دھندلا کر دیا ہے۔ "یوں اپنے ہی سماج و تہذیب سے وابستہ انسان جو اپنے" ہونے اپنی شناخت اور اُس شناخت کے توسط سے کچھ "بننے" اور "کچھ کر گزرنے" کے فطری اشتیاق سے کوسوں دور چلا جارہا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں اس کی فطرت سے وابستہ حقیقت منوں مٹی تلے دفن ہو گئی ہے"(۳)

اہل یونان جو صدیوں تک علوم و فنون کا مرکز رہا یا پھر سومیری تہذیب، اسی طرح سے سلطنت روما، عباسی خلافت، مغلیہ سلطنت اور عثمانی سلطنت یا پھر یورپ جس نے انسانی وجود اور شناخت پر سوالات اٹھائے۔ بہر کیف ہر وہ زمانہ جس میں انسان کے وجود اور اس کی سماجی حیثیت کو آزادانہ روی کا حامل تصور کیا گیا، اُس وقت تک ان مذکورہ تہذیبوں کے سیل رواں میں مستقبل کی نسلوں نے اُسے "سنہری زمانے" سے یاد کیا۔ مگر جوں جوں محاذ آرائیوں، معاشرتی کشمکش، عدم موجودگی، سماجی انتشار، اقتصادی بحرانوں اور مذہبی تنگ نظریوں نے انسانیت کو ایذا رسانی اور عقوبت سے ہم آغوش کیا۔ انسان کی آزاد روش اور سماجی حیثیت پابندِ سلاسل ہو گئی۔ کیرول کوئیگلی اپنی کتاب The evolution of civilization: introduction to historical Analysis"

میں لکھتے ہیں:

"شدید اقتصادی کساد بازاری، زوال پذیر معیار زندگی، مختلف پوشیدہ مفادات کے درمیان خانہ جنگیوں اور بڑھتی ہوئی ناخواندگی سے سماج کمزور سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ قانون سازی کے ذریعے زیاں کو روکنے کی لاحاصل کوششیں کی جاتی ہیں لیکن زوال جاری رہتا ہے۔ معاشرے کے مذہبی ،علمی، سماجی اور سیاسی طبقات عام لوگوں کی وفاداری سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نئی تحریکیں معاشرے کو لپیٹ میں لے لیتی ہیں"۔(4)

یوں تہذیبوں کے پُر مسرت اور پُر کیف سنہری ادوار میں ہمیشگی کے تصورات نے فروغ پایا مگر بیرونی سازشوں، اپنوں کی بے مروتیوں، داخلی شکست وریخت کی وجہ سے یہی تہذیبی و سماجی سنہری ادوار ڈرامائی انداز میں بڑی تیزی کے ساتھ روبہ زوال ہوئے۔ جس سے انسانی شناخت بے بہرہ ہو کر رہ گئی۔ انسانی ذات اور شناخت کے متعلق تصورات گذشتہ تہذیبوں میں کسی ناکسی صورت میں اجاگر ہوتے چلے آئے ہیں مگر مغربی دور کی صنعتی ترقی کی آندھی نے گذشتہ تمام تصورات کو ریزہ ریزہ کرتے ہوئے انسان کے وجود اور ذات سے متعلق تصورات کو بھی تہ بالا کر دیا ہے۔ ہر چیز میں مادی مفادات کو اولیت دی جانے لگی ہے۔ انسانی حیات جو کسی ناکسی صورت میں فطرت سے رابطہ استوار کیے ہوئے تھی اب مشینی رویوں میں بدل گئی ہے۔ ناجذبات، نااحساس مروت اور ناہی اپنائیت کا جذبہ۔ انسان جیتی جاگتی صورت گری سے ایک مشینی بے حس مورت میں بدل گیا۔ مادی آویزش اور کشمکش نے روح کی پکار کو ماند کر دیا ہے۔ چنانچہ اس بے حسی اور اپنی وجودی شناخت کی بے مائیگی سے متعلق بیسویں صدی کے اوائل میں پولیز (1920ء) نے سریلزم کی تحریک کا آغاز کیا جو بنیادی طور پر بورژوا استحصالیت کے خلاف ایک موثر آواز تھی۔ اس تحریک نے انسانی وجودیت، روحانیت اور ثقافت پر کاری ضرب لگائی۔

نطشے نے سُپر مین کا تصور پیش کیا مگر یہ سُپر مین اپنی طاقت کے نشے میں خود کو برتر اور حکمران ثابت کرنے لگا۔ نطشے کے ہی سُپر مین اور سُپر قومیت کے تصور نے نازی ازم کو جنم دیا۔ اس فلسفے نے دوسری جنگ عظیم کے لیے راہ ہموار کی۔ یوں انسانیت کا بے دریغ خون بہایا گیا۔ یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے زمانے میں انسانیت، ذات انسان اور کائنات کا وجود بحث ومباحثہ کا مرکز بنا۔ انسان کی آزادی کے افکار بلند ہوئے۔ روسو نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ انسان کو فطرت کے مطابق آزاد گردانتا تھا۔ اسی لیے روسو نے کہا تھا کہ:

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو پابہ زنجیر ہے"۔(۵)

کانٹ مذہب اور انسانیت کے درمیان تعلق پیدا کرتے ہوئے انسان کی آزادی اور عظمت ووقار کا قائل تھا۔ اس نے انسانیت پر روا رکھے گئے ظلم وجبر کی مخالفت کی۔ کانٹ چاہتا تھا کہ جس طرح فطرت انسان پر ظلم وجبر نہیں کرتی بالکل اسی طرح ایک انسان بھلا دوسرے انسان پر کس طرح ظلم وستم کا بازار گرم کر سکتا ہے۔ بہت سے مغربی دانشوروں نے "ہمہ اوست" کا تصور بھی پیش کیا ہے جس میں انسانیت کے تشخص اور وقار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ خاص طور پر "اسپنوزا" جس نے کہا تھا کہ خدا کا ایک روپ ہے۔ اس روپ کی بدولت انسان آزادی سے محروم رہتا ہے۔ کیوں کہ خدا کی جانب سے ہر عمل کے لیے ایک پابندی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے انسان کی آزادی کا امکان ماند پڑنے لگتا ہے۔ اسی فلسفے نے قضاوقدر کے تصور کو اجاگر کیا۔ مشرق کے صوفیا نے اس بات پر وحدت الوجود کا تصور پیش کیا۔ انسانیت کی بقا اور شناخت سے متعلق ایک تصور برکلے نے بھی پیش کیا۔ اس فلسفے کی رُو سے انسان اپنے خیالات وافکار کی آماجگاہ میں محصور رہتا ہے۔ اس کے سامنے جو بھی حقیقت ہے وہ درحقیقت ہمارے افکار ہی کا پیش خیمہ ہے۔ انہیں افکار وخیالات سے ہی حقیقت کی تخلیق ہوئی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور انسانیت کے قتل عام کے بعد دوسری جنگ عظیم نے مغربی دنیا اور مشرقی دانشوروں کو سوچنے پر مجبور کیا آخر انسانیت کے ساتھ اس طرح کا رویہ کیوں رکھا جاتا ہے۔ انسان کی اپنی شناخت اور وجودیت کیوں کر مسخ ہو رہی ہے۔ اور یہ کہ انسان کو فطرت سے کیوں کاٹا جا رہا ہے۔ اس قسم کے بے شمار سوالات نے فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک میں انسانی وجودیت کے تصور کو اُبھارا۔ ژاں پال سارتر نے 1952ء میں "ساں ژینے" جیسے لافانی حقیقی کردار کی بدولت انسان کے وجود کا تصور پیش کیا۔ اس تصور نے بورژوا طبقے کی منافقت اور اشرافیہ کی جبریت کے برعکس ایک باشعور انسان کی ذات کو خاص آہنگ میں سمو کر دکھایا۔ سارتر کے خیال میں انسانی تاریخ پہلے سے کوئی وجود نہیں رکھتی۔ انسان جب جنم لیتا ہے تو اس وقت سے لے کر عہد بلوغت تک اس کی خواہشات، آرزوئیں اور تمنائیں جس انداز سے تشکیل نو پاتی ہیں وہ اُس کی آزاد روش کی عکاس ہوتی ہیں۔ جس طرح سے انسان آزاد پیدا ہوا۔ اِس کی نشوونما کے مراحل آزادی سے پائہ تکمیل کو پہنچے اور فطرت نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی طرح انسان کی ذاتی زندگی کی تشکیل، خواہشات کا انتخاب اور سماج کے ساتھ راستوں کا تعین کا فیصلہ بھی اُسے خود کرنا چاہیے۔ سارتر کے اس تصورِ انسان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے دیویندر اسر لکھتے ہیں:

"انسان کی فطرت اس کی ذاتی زندگی کے فیصلوں کی تشکیل اور ربط کے ذریعے عیاں ہوتی ہے۔ تاکہ انسان کی فطرت سے جس کی کوئی واضح اور یقینی صورت موجود نہیں بلکہ اُس کی زندگی کی حقیقی کلی حیثیت ہی اس کی فطرت ہے۔ انسان خارجی اقدار کے باعث نہیں بلکہ اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ اور عمل کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے خود (Self) کا انتخاب کرتا ہے۔ جب کوئی انسان انتخاب کرتا ہے تو اس کے سامنے کئی طرح کے امکانات ہوتے ہیں اور جب وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرتا ہے تو وہ قدر کا ادراک حاصل کرتا ہے"۔(۶)

ہر تہذیب کی تزائین وزیبائش اور بالیدگی میں سماجی فرد کی شناخت کے وسیع تر حوالے دستیاب ہیں۔ یہ ایک طرح کی ثقافتی اکائی ہے جس میں افرادِ معاشرہ کی اعلیٰ ترین صفات اور مشترکہ خارجی عناصر مثلاً زبان، تاریخ، مذہب، روایات اور اداروں کا نظام، افراد کی داخلی شناخت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لوگ اپنی شناخت یا وجود کا از سرِ نو تعین تو کر سکتے ہیں مگر وجودیت سے متعلق شناخت جو اُسے فطرت نے آزادی کی صورت میں دی ہے۔ اس کا ادراک انسان کی ذات اور وجود کی آزاد روش سے جڑا ہوا ہے۔

انسان اپنے سماج کا ایک باکمال فرد ہے جو معاشرت کی راہیں متعین کرتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں خود سے وابستہ صلاحیتوں کو سامنے لاتی ہیں۔ گویا انسان کی ذات اور وجود سے وابستہ قوتوں کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہر تہذیب کے ادب وفنون میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ یونان میں اوووڈنے اپنے میٹامورفوسس میں پری لری اوپ، اس کا بیٹا نارسس اور اس کی محبوبہ اسپرا ایکو کو خود کی شناخت کا اسیر ہوتے ہوئے دکھایا۔ ہومر کی ایلیڈ میں بھی انسانی عظمت و وقار کو پیش نظر رکھا گیا۔ شکسپیئر کے ڈراموں ''اوتھیلو''، ''میکبتھ'' اور ''ہیملٹ'' میں انسان کی عظمت اور وجودی قوت کا برملا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً جب ہیملٹ کا مرکزی کردار کہتا ہے کہ:

> ''کتنا شاندار شاہکار انسان ہے، اپنی عقل، شرافت میں کتنا شریف ہے۔ اپنی صلاحیتوں میں کتنا لامحدود ہے۔ اپنے اظہار و مطالب اور عمل و حرکت میں کتنا واضح اور لائق تحسین ہے۔ اپنے عمل میں کس قدر فرشتہ ہے۔ اپنے فہم و ادراک میں کس قدر مثل خداوند ہے۔ وہ کائنات کا حسن ہے۔ اس کی روح دنیا کی بہترین تخلیق ہے''۔(۷)

مشہور فرانسیسی مفکر البرٹ کامیو، فلابز بادلیئر، روسی افسانہ نگار چیخوف، موپساں، ٹالسٹائی، میکسم گورکی، معاشی اشتراکیت کی ایک طاقتور آواز کارل مارکس، لینن اور فلسفہ وجودیت کے امام ژال پال سارتر نے انسان کی عظمت و وقار اور وجودیت کی قوت کو حقیقی روپ میں جلوہ فگن کیا۔

مغرب میں جس انداز سے تصورِ انسان کا پرچار کیا گیا۔ مشرق میں بھی اس کی ضوفشانی کی کرنیں قدیم وجدید عہد کی شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ولی دکنی سے لے کر قلی قطب شاہ تک، میر تقی میر سے لے کر غالب تک اور پھر الطاف حسین حالی سے لے کر اقبال تک انسان کی ذات اور شناخت کو خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ عہد جدید میں میراجی، راشد اور مجید امجد نے انسان کی ذات سے متعلق سوالات کو اپنے فن پاروں کی زینت بنایا ہے۔

جدیدیت کی اختراع سے رونما ہونے والا شاعرانہ عمل انسانی حیات کے داخلی وخارجی افکار کی نشاندہی کرتا ہے جس کی پیدائش کسی مافوق الفطرت دنیا کی آماجگاہ میں نہیں ہوئی بلکہ اس کا تعلق انسان کے شعوری ورثے کا ثمر بار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جدیدیت عصری مسائل سے عبارت ہے یا تہذیبی کشمکش اور سماجی حیات کی پیچیدگیوں کو نئے سرے سے پیش کرنے کا عمل ہے۔ جدیدیت عصریت سے کسی طرح سے بھی میل نہیں رکھتی لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں اپنے زمانے کی سچائیوں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انسانی روایات، تاریخ، سماجی مسائل، ثقافتی ورثے کو برانگیختہ کرتی ہے تو دوسری طرف انسان کی ذات سے وابستہ ذہنی وجذباتی الجھنوں اور گھٹا کی تاریکی کو حقیقت کا جامہ پہناتے ہوئے نئے نئے رجحانات کی صورت میں جلوہ فگن کرتی ہے۔ یوں جدیدیت انقلاب آفرین تبدیلیوں سے موسوم ہو جاتی ہے۔

انیسویں صدی کے عہد جدید میں فروغ پانے والے شعر و سخن نے انسان کا رشتہ فطرت کے ساتھ پیوست کرتے ہوئے انسانی حیات کے کئی رنگوں کے طلسم کو اجاگر کیا جس کی سحر آفرین بحروں میں انسانی مسائل و معاملات کی سرگزشت سنائی دیتی ہے۔ علامہ اقبال اس صدی کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے اپنے عہد کی صنعتی و مشینی انقلابیت، سرمایہ دارانہ نظام، معیشت، بورژوا طبقے کی استعماریت، پرولتاریہ کے نام پر بننے والے سامراجی نظام کی بندشوں جس نے صدیوں سے اکٹھے رہنے والوں کو سرحدوں کے جال میں مقید کر دیا، مغربی جمہوری نظام کی بدولت طبقۂ اشرافیہ کی اولیت و حکمرانی کی پختگی اور اشتراکیت کی انقلاب آفرین تصوریت کو قریب سے دیکھا، محسوس کیا اور ان تمام تصورات و تحرکات کے نتیجے میں انسانی وجود کی شناخت کی بے حرمتی کو دیکھا جس سے انسان کی حقیقی آزادی اور روحانیت سلب ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں اِس جدید عہد کے انسان کی ذہنیت، اضطراب، نفسیاتی تناؤ، سماجی و اخلاقی اقدار کی بے مروتی اور روحانی مسائل کا احساس جاوداں ہے۔

اقبال کی شاعری عہد جدید کے تخلیقی و ذہنی ارتقا کا استعارہ ہے جس کی بدولت انسان کی سماجی شناخت اور وجودیت کی آزادی کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اقبال کی شاعری میں ایک طرف انسان کے داخلی رجحانات کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ تو دوسری جانب وہ اپنے اسلاف کی عظمت رفتہ کے تصور کو بھی برانگیختہ کرتے ہیں جس میں اسلامی افکار اور تصورِ خودی جو مردِ مومن کی معراج ہے، اس کو سامنے رکھتے ہیں۔ اقبال کے اِسی شاعرانہ وصف کی عظمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''نئی نئی اقدار اور تہذیبی مسائل سے اقبال کے اس ذہنی قرب کی بنا پر انہیں جدیدیت کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ اقبال ان بڑے شعرا میں سے ہیں جو ہمیشہ تعمیر و تخریب کے سنگم پر نمودار ہوتے ہیں جن کے ہاں ایک طرف نئے زمانے کی شکست وریخت کا عرفان ہے اور دوسری طرف ماضی کے نظم وضبط کا احترام موجود ہے''۔(۸)

لہٰذا اقبال کا شمار عہد جدید کے ان شعرا، مفکرین اور دانشوروں میں ہوتا ہے جنہوں نے فلسفے کو ایک نئی مابعد الطبیعیاتی تعبیر سے ہم کنار کیا۔ اس وصف کی بدولت انسانی فکری تاریخ، خودی، انا اور اس کی فطری شناخت تخلیقی فعلیت کا موجب بن گئی ہے۔ اقبال نے اسلامی تفکر کی روحانیت کی اساس کو ایک ہمہ گیر تحریک کے روپ میں جلوہ گر کیا ہے۔ ایک ایسا احساس جو انسان کی آزادی کا قائل ہے۔ جب کہ دوسری جانب انسان کی ذات، اس کی روح اور نصب العین کو نئے آہنگ سے مزین کیا جو فطرت نے انسان کو دے رکھا ہے۔ اسی طرز احساس اور تصور ذات حیات کی درخشندگی کو سامنے رکھتے ہوئے ڈاکٹر انصاری لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے شاعری کو ایسے علوم وفنون کا حوالہ بنا دیا ہے جن کے بغیر عصرِ رواں میں انسانی زندگی کی کوئی تشریح یا تعبیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ فلسفہ جو ہمارے قدیم مکتبوں میں اشارات بو علی سینا، شمس بازغہ یا سُلّم العلوم تک محدود تھا۔ اقبال اُسے عملی زندگی کی بساط پر لے آئے اور ثمریت یا نتائجیت کا ایک ایسا منہاج پیدا کیا جو بیک وقت تصوریت یا عینیت (Idealism) اور حقیقت پسندی (Realism) کا ایک متوازن امتزاج پیش کرتا ہے''۔(۹)

اقبال کی اس فکری حساسیت اور تصورِ ذات انسان کو تقویت بخشنے میں اسلامی فکر اور فلسفے کے آفاقی راہنماؤں مولانا رومی، بیدل کی مثنویات (عرفان، طلسم حیرت اور محیط اعظم)، شاہ ولی اللہ دہلوی (لمعات، سطعات اور نعات) اور مجدد الف ثانی اور ابن عربی (نصوص الحکم) کی نگارشات نے اہم کردار ادا کیا۔ اسلامی فکر اور قرآنی تصور انسان کی روشنی میں خدا، کائنات اور انسان کے مابین گہرا تعلق ہے۔ قرآن مجید میں انسانِ کامل کے لیے عبد کا لفظ مروج ہے جبکہ عبدہ سے مراد حضور سرورِ کائنات ہیں۔ قرآن کریم کی روشنی میں آیات کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف انسان کو صاحب یقین قرار دیا گیا ہے بلکہ اِسے نائب خدا کا شرف بھی نصیب ہے۔ اقبال اس عبد یعنی انسانِ کامل کو لامتناہی قوت و توانائی کا حامل سمجھتے ہیں زبورِ عجم میں اس کی تائید میں اقبال نے کہا ہے:

ے ما از خدا ای گم شدہ ایم او بہ جستجو است

اور یہ بھی لکھتے ہیں:

ے خدا ھم در تلاش آدمے ھست

اقبال نے زبور عجم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات اور نائب کا وصف رکھنے کی بنا پر لاھوت کی طرف مائل پرواز ہے۔ وہ اس شاہین کی مانند بے خاطر پرواز ہے جو سدرۃ المنتہیٰ اور اعلیٰ علیین (بہشت کی کھڑیوں) سے بھی کہیں دور لامتناہی درجات حاصل کر سکتا ہے۔

بقول اقبال کے

''چاہے زندگی بدل ڈالے ہئیت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے۔''(۱۰)

''ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ
یہ پورب، یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ''(۱۱)

اقبال کے انسان کی وسعت تو نیلگوں آسمان کی بلندیوں سے بھی آگے ہے۔ اس کا پختہ یقین، ایمان کامل یُومنون بالغیب کے مصداق ہے جو ہر چیز پر آہنی گرفت رکھتا ہے۔ اقبال نے انسان کی اس وجودیت کے پیش نظر صاحب یقین کی اصطلاح مروج کی ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

'' وجودیت کے فلسفے کی رو سے اِسے آتھینٹک فرد'' سے موسوم کیا ہے'' (12)

جو مغربی وجودیت پسندوں ہائڈگر، البرٹ کامیو، سارتر، کرک کارد، گیبریل مارسل اور کارل لیسیر وغیرہ نے پیش کیا۔ وجودیت پرستوں کی اس فہرست میں دو طرح کی فکر پائی جاتی ہے۔ سارتر اور اس کے حامی خدا کی ہستی کو تسلیم ہرگز نہیں کرتے جبکہ کرک گارد اور مارسل وغیرہ خدا کے قائل ہیں۔ چنانچہ مغربی فکر دو کشتیوں پر سوار ہے اور کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچ سکے۔ یوں صاحبِ یقین، خود آشنائی کی لگن اور انفرادیت کے وسوسوں کی بدولت انسانِ کامل کی ذات بے چہرہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر اقبال یقین و

ایمان کی پختگی، اطمینان و اعتماد کی بحالی اور حواس و قلب و وجدان کی تکوینی مغلوبیت کے طفیل خودی کو بلند کرنا چاہتے ہیں جس کی پختگی سے انسان ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے۔ اقبال نے حلاج کی زبانی جاوید نامہ میں اس وجودیت کی تعبیر اِن اشعار میں کی ہے۔

"پیش اوگیتی جبیں فرسودہ است
خویش را خود عبدہ ، فرمودہ است
عبدہ ، از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر ہر است

عبدہ ، چند وچگونِ کائنات
عبدہ ، رازِ دردنِ کائنات"(۱۳)

اقبال جب مغرب میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو وہاں انسان کی ذات اور مادے کی روح کو سمجھنے کے لیے مختلف تصورات اُجاگر ہوئے۔ برگساں، وہائٹ ہیڈ، نطشے، بریڈے، یرڈ اور گوئٹے وغیرہ کے تصورِ زیست اور مادہ نے ایک ایسا تناظر فراہم کیا جس میں مادیت پرستی اور انسانیت کے فطری پن کی آواز کو نئے پراہن سے سجایا گیا۔ انسانی سماجیت کی روح اور نفسیاتی ذہنیت کو سمجھنے میں میگڈوگل اور ولیم جیمز کے تصورات حیات نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اقبال نے ان تصورات کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ یہ اُسی بینی کا ثمر بار تھا کہ اقبال نے اپنی قوت متخیلہ کے طفیل انسانی شناخت کا ایک ایسا نظامِ حوالگی (Frame of Reference) تخلیق کیا جس میں ماضی، حال اور مستقبل میں انسانی فطرت اور آزاد روش کو زندہ کیا گیا ہے۔

اقبال نے انسان کی فطری آزادی، انفرادیت اور یکتائی کو اپنے چوتھے خطبے (خودی۔۔ اس کی آزادی اور بقا) میں قرآنِ مجید کی آیات، شاہ ولی اللہ دہلوی کی تعلیمات اور مغربی فلسفہ کی خود شناسی اور وجودیت کو پرکھتے ہوئے تصورِ انسان کے کامل وجود کی حقیقت کو عیاں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افکار، خطبات اور شاعری کی بدولت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان ساری کائنات میں اشرف المخلوقات اور عظمت و وقار کا حامل ہے۔ اقبال نے انسانی عظمت کو ثابت کرنے کی خاطر قرآن مجید کی سورہ طٰہٰ آیت نمبر (122-20) اور سورۃ البقرہ آیت نمبر (30،2) کو بطور حوالہ کے پیش کیا ہے۔

1۔ "انسان خدا کا چنا ہوا ہے اور پھر اس کے رب نے اسے (آدم کو) برگزیدہ کیا، اُس کی توبہ قبول کی اور اِسے ہدایت بخشی"۔

2۔ "انسان اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود زمین پر خدا کا نائب ہے"۔

3۔ "جب تمہارے خدا نے فرشتوں سے کہا تھا کہ " میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا، " کیا آپ زمین پر کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے نظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم ہی کر رہے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے"۔

اقبال نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آیات کریمہ کی بدولت یہ ثابت کرنے کی جستجو کی ہے کہ فطرت نے انسان کو ایک آزاد شخصیت کے روپ میں پیدا کیا ہے۔ انسان روح ارض پر خدا کا نائب ہے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جب خدا نے خود انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرتے ہوئے بلند مقام و مرتبہ عطا کیا ہے تو پھر کیسے وہ استعماریت زدہ اور سامراجی قوتوں کی جکڑ بندیوں میں پابہ زنجیر ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انسانی شعور کی وحدانیت جس کے گرد انسان کی شخصی قوتِ ثقل تشکیل دی گئی ہے۔ اس کی روح ایک لطیف قسم کی مادانیت نہیں جو کسی حادثے کا شکار ہو کر مر جائے جیسا کہ مسلم فلسفیوں نے یونانیوں، نسطوریوں، یہودیوں یا پھر زرتشتیوں کے خردمندانہ ثقافتی نظریہ سے استفادہ کرتے ہوئے بیان کیا۔ اقبال خدا کی ارفعیت کو مانتے ہوئے قطرے کو سمندروں میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اسی بنا پر انسان کا جرأت مندانہ اثبات حقیقی آہنگ کے ساتھ آزاد تخلیق کا ثمر بار بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کے ابتدائی آثار بانگ درا کی نظمیں ہیں جو فطرت سے مطابقت رکھتی ہیں جیسے "انسان اور بزم قدرت"، "رخصت اے بزم جہاں"، " سرگزشتِ آدم" اور "خضر راہ" وغیرہ میں انسان کی زندگی اور حقیقت کو احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے جبکہ بال جبریل کی دو نظمیں "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے" اور "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں اقبال نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان جذبات و احساسات کا حامل ایک ایسا باشعور کردار ہے جو اپنی داخلی و خارجی صفات اور روحانیت کی بنا پر خوددار ہے۔

"تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے"(۱۴)

"عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سِرشت میں ہے کوکبی و مہ تابی
تِری نوا سے ہے بےپروا زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی"(۱۵)

(فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے)

جب زمین آدم کا استقبال کرتی ہے تو اقبال اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتی ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

"نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ"(۱۶)

جب فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ زمین و آسمان کی تسخیر انسان کی خاطر کی گئی ہے۔ وہ انسان جو لامتناہی خوبیوں اور جواہرات کا مالک ہے۔ روح ارضی پر اُمید و بیم کا معرکہ اس کا منتظر ہے۔ اور یہ کہ انسان کی زیست میں آرام و مصائب اور خوشیوں سے لطف اندوزی قدرت کی طرف سے رکھ دی گئی ہے۔ وہ محبت کا خریدار بھی ہے اور جنت اس کے خون و جگر میں پوشیدہ ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو اپنی مرضی سے دنیا کی تقدیر چلا سکتا ہے یعنی زمانے کا اُتار چڑھاؤ اور شائستگی و انار کی اس کے ہاتھ میں ہے۔ فطرت جس طرح چاہے اس کائنات کے نظام کو چلا سکتی ہے اور یہ کہ اس نظام کو چلانے میں انسان کی ان قوتوں کا پرتو ہے جو قدرت کی طرف سے اُسے ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ انسان ہی تو ہے جس کی بدولت زندگی کے نغمے الاپے جا رہے ہیں۔ اسی کے ساز سے حیات کے مضراب کو چھیڑا جا رہا ہے۔ تو گویا خدا نے اُسے یعنی انسان کو جن کمال جواہرات زیست سے نوازا

ہے تو پھر زندگی کا حقیقی روپ بھی اسی کے تابع ہونا چاہیے۔ وہ انسان جس کو قدرت نے خضر راہ بنایا ہے مگر جدھر دیکھتے ہیں صحرا نوردی کا مرتکز ہے اور اِسی جہد مسلسل کو جام زندگی قرار دیتا ہے۔ بقول اقبال

"پختہ ترے گردش پیہم سے زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوام زندگی"(۱۷)

اقبال کے نزدیک انسان کی بقا قوموں کی تعمیر و ترقی اور تسخیر کائنات سے ممکن ہے مگر اس دنیاوی خداؤں کے تراشدہ نظام حیات (سرمایہ داری، بورژوا، ملوکیت ،بادشاہت، جمہوریت اور اشتراکیت) نے انسان سے اس کی آزادی چھین لی ہے۔ وہ آزادی جو قدرت نے اس کی سرشت میں پنہاں رکھی ہے۔ جس کے طفیل وہ محنتِ پیہم، جہد و مسلسل، کشمکش و معرکہ آرائی اور سخت کوشی کر سکتا ہے۔ جو اس کی پہچان ہے۔ اُسی پہچان کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اقبال انسانی شرف و فضیلت اور عظمت کا قائل ہے۔ ان کے نزدیک انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کے اندر جرأت و بے باکی، وسیع النظری، بلند ہمتی اور استقلال جیسی خوبیاں جاوداں ہوں۔ وہ امروز فردا کے چکر میں نہ الجھے اور نہ ہی سود و زیاں کے اندیشے میں مبتلا ہو۔ اور یہ اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب وہ خودی کی منازل (نفس امارہ، نفس ملہمہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ، نفس راضیہ، نفس مرضیہ، نفس کاملہ) سے آشکار ہو کر خود آشنا ہو جاتا ہے۔ اقبال نے نظم "زندگی" میں انسانی تصورِ حیات کی تعبیر یوں بیان کی ہے:

"برتر از اندیشہ ، سُود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرِّ آدم ہے ، ضمیر کُن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی"(۱۸)

اقبال ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے جب دنیا جنگ عظیم اول کی قیامت خیزی سے جل رہی تھی۔ انسانیت کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ سرمایہ دارانہ اور بورژوا نظام کی استحصالیت اور سامراجی نظام کی جکڑ بندیاں عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی کے پہلے ربع تک دنیا بورژوا اور پرولتاریہ طبقے میں منقسم تھی۔ بورژوا نظامِ زندگی میں جاگیر دارانہ قوتیں کسانوں، کاشتکاروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کا استحصال کرتی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے "انلائٹن منٹ یا دورِ تنویر میں انسانی مسائل کو والٹیر، گروٹیس، ہیوم، روسو اور کانٹ کے افکار میں حل کرنے کی کوشش کی گئی"۔(۱۹) جس کے نتیجے میں بورژوا نظام کی استحصالیت سے تو نجات مل گئی مگر وہ سہانا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا جس کی بدولت غربت زدہ انسانیت کو جنت ارضی نصیب ہو سکے۔ اب دولت جدید صنعتی عہد میں جاگیر داروں کی بجائے تاجروں، کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہ وہ دور تھا جب انسان کو جاگیر داروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی پنجۂ آہنی سے نجات تو مل گئی مگر وہ افراد جو کبھی کھیتوں میں مزدوری کرتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے بڑے صنعتی شہریوں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔ یوں پہلے پہل تو کارخانوں، صنعتوں اور فیکٹریوں میں مزدوروں کی تعداد میں ہوش ربا اضافہ ہوا۔ بعد میں وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ جدید مشینری نے انسانی ہاتھوں کی جگہ لینی شروع کر دی۔ نتیجتاً یا تو مزدوروں کو اُن کا جائز معاوضہ نہ دیا جاتا یا پھر مزدوروں کو بغیر کسی وجہ کے فیکٹریوں سے نکال دیا جاتا۔ اس طرح انسان ایک غلامی سے نکلا تو دوسری نے سرمایہ داری کے روپ میں اِسے اپنے حصار میں لے لیا۔ مغرب میں سوشلزم اور کیمونزم کی

تحریکوں نے انسان کو اپنے تئیں آزادی دلانے کی جستجو کی مگر غلامی کے گھمار چکر سے نجات نہ دلا سکیں۔ اشتراکیت پسندوں نے کارل مارکس کی بات سنتے ہوئے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ اشتراکیت کی بنیاد کارل مارکس کی کتاب "داس کاپیٹل" بنی جس کو اشتراکی صحیفہ قرار دیا گیا۔ ان اشتراکیت پسندوں کو مغرب میں کوئی خاص کامیابی نہ مل سکی ایک طویل جدوجہد کے بعد بالآخر روس میں لینن کی قیادت میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ یوں اشتراکیت کی تحریک نے زندگی کے تمام شعبوں پر اثرات مرتب کیے۔ دنیا نے اِس کو انقلاب آفرینی گردانا اور ترقی پسندی سے موسوم کیا۔

اقبال نے اپنے قیام مغرب کے دوران سوشلسٹوں اور کیمونسٹوں کی تحریکوں کے محرکات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ اقبال کسی حد تک ان انقلابیت آمیز تحریکوں کے افکار سے متاثر ہوئے مگر کلی طور پر اِن کی فکر سے مطمئن نہ تھے کیوں کہ انہوں نے انسان کو کسی حد تک حکمران طبقے، اشرافیہ، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا غلام ہی بنایا۔ اقبال نے "اشتراکیت" کارل مارکس کی آواز"، "انقلاب"، "موسیولینن"، "قیصر ولیم"، "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور"، "الارض للہ"، "فرمانِ خدا فرشتوں سے"، "جمہوریت"، "پنجاب کے دہقان سے" جیسی لازوال نظمیں تخلیق کیں۔ نظم "پنجاب کے دہقان سے" میں لکھتے ہیں:

"بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز

اسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہوگئی ، اب تو جاگ!

زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات

زمانے میں جھوٹا ہے اُس کا نگین
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

بُتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رُسوم کہن کے سلاسل کو توڑ"(۲۰)

اقبال انسان کے اندر بیداری کی روح پھونکتے ہوئے حقیقی زندگی اور اس کے مقام و مرتبے سے آشنا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسان دنیاوی ذات اور رنگ و نسل کی زنجیروں کو توڑ دے، اپنے بدن کی مٹی کو پہچانے۔ اپنی آزادی، اپنی فطری شناخت اور خودی کو دولت کے چند سکوں کے عوض نہ فروخت کرے۔ کیوں کہ خودی ایک ایسی چنگاری ہے، ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہ محض ایک ندی نہیں بلکہ قدرت کی جانب سے انسان کو دی گئی صلاحیتوں اور قوتوں کا مجسمہ ہے جس کی بدولت انسان معرفت سے آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

تیری زندگی اِسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی ، نہ رہی تو رُو سیاہی"(۲۱)

جون اسٹیورٹ، ہربرٹ اسپنز اور ڈارون وغیرہ نے بنی نوع انسان کو نفس واحد اور مختلف اعضا کا مجموعہ تصور کیا اور یہ کہا کہ ہر عضو کا اپنا اپنا کام ہے چنانچہ اقتصادیات اور شب وروز کے امور میں بھی ایک فطری تقسیم ہے۔ بعض کارخانوں کے مالک تو بعض دماغی کام اور ہاتھ پاؤں ہلا کر محنت کرنے والے ہیں۔ یوں اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے ہیں۔ انہوں نے اِس تہذیبی و تمدنی ساختیے کو درست قرار دیا جس میں دولت مند جاگیرداروں، وڈیروں، صنعت کاروں یا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہے۔ اس کے برعکس اقبال ایسی تقسیم کو انانیت اور محنت کش لوگوں کے ساتھ دھوکہ قرار دیتے ہیں جب اگسٹس کومٹ شیخ سعدیؒ کی زبانی کہتا ہے:

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
ہماں نخل را شاح و برگ و براز"(۲۲)

کومٹ کا نکتہ نظر یہ ہے کہ بنی نوح انسان کسی غیر مرئی آفرینش کی تخلیق نہیں بلکہ یہ تو فطری پیداوار ہے جس میں سوچنے، سمجھنے اور چلنے پھرنے کی قوتیں اپنا کام کرتی ہیں۔ انسانی طرزِ زندگی میں جو تفریق ہے وہ فطرت کی کرشمہ سازی ہے فرانسیسی فلسفی اگسٹس کرمٹ کی زبانی اقبال کہتے ہیں:

"دماغ از خرد زاست ، از فطرت است
اگر پا زمیں ساست از فطرت است

یکے کار فرما، یکے کار ساز
نیا ید ز محمود کار ایاز

نہ بینی کہ از قسمت کار زیست
سراپا چمن می شود خار زیست"(۲۳)

کومٹ کی اس بات پر لب کشائی کرتے ہوئے اقبال نے مزدور طبقے کی زبانی جواب میں لکھا کہ آپ کیسے حکمت کے پردوں میں پڑتے ہوئے ہمیں دھوکہ دیتے ہو کہ یہ تقسیم فطرت کی کرشمہ سازی ہے۔ اس کو اسی طرح جاوداں رہنا ہوگا۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کارفرما سرمایہ دار، تاجر، جاگیردار اور وڈیرے صنعت کار انسانیت کا کوئی خاص عضو نہیں۔ یہ تو چور ہیں جو انسانیت کا خون چوستے ہیں۔ محنت ہم کرتے ہیں اور عیش و عشرت سے یہ رہتے ہیں۔ آپ پر افسوس کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے کہ آپ چوروں اور دھوکہ بازوں کی حمایت کرتے ہیں۔ "مردِ مزدور" کی زبانی کہتے ہیں:

"فریبی بحکمت مرا اے حکیم
کہ نتواں شکست ایں طلسم قدیم

مس خام را از زر اندودہ ای؟
مرا خوئے تسلیم فرمودہ ای؟"(۲۴)

اقبال مزدور کی زبانی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کوہ کن کو نصحت کرتے ہیں کہ پہاڑ کاٹ کر پرویز اور اس کی محبوبہ کے لیے جوئے شیر لائیں اور یہ کہیں کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف اور دانشوری ہے۔ یہاں پر اقبال نے پرویز کو بطور تلمیح سرمایہ دار سے مشابہت دی ہے۔ اس کی شان و شوکت، اس کی ثروت اور کمزور لوگوں پر جبر و استبداد سے حاصل ہونے والی مسرت کو محبوبہ سے تشبیہ دینا ایسا وصف ہے جس کی جھک اُن سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کی مسکراہٹوں سے نظر آتی ہے جو انسانیت کا استحصال کرتے ہیں۔ اس کیفیت کا اظہار مزدور کی زبانی کانٹ سے مکالمہ کرتے ہوئے کرتے ہیں:

"کند بحر را آبنا یم اسیر
ز خارا برد تیشہ ام جوئے شیر
حق کوہ کن وادی اے نکتہ تنج
بہ پرویز پُر کار و نابردہ رنج؟"(۲۵)

اور پھر اقبال کہتے ہیں کہ یہ سرمایہ دار، جاگیر دار اور تاجر واشرافیہ جنہیں مفت خوری اور خواب خوش کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ یہ تو زمین پر بوجھ ہیں۔ غریب انسانوں کے ہاتھوں کی محنت پر ڈاکہ زنی کرتے ہوئے ان بے چاروں کا سکون تہ و بالا کرتے ہیں جن سے انہیں قلبی راحت میسر آتی ہے۔ یہ ایسے ڈکیت ہیں۔ جن کو قانونی حق دیا گیا ہے۔ ایک ایسا حق جو زمین کے ان ناکردہ خداؤں کا خود ساختہ ہے۔ بقول اقبال:

بدوش زمیں بار سرمایہ دار
ندارد گرشت از خور و خواب کار
جہاں راست بہر وزی از دست مزد
ندانی کہ ایں ہیچ کار است دزد"(۲۶)

آگے چل کر لینن کی زبانی کہتے ہیں کہ سماجی انسان چکی کے دو پاٹوں کے مابین گھرا ہوا ہے جہاں ایک جانب انسانیت کا خون چوسنے والے ہیں اور دوسری جانب کلیسا اور دین کے دعوے دار ہیں۔ یوں ملوکیت، بادشاہت اور مذہبیت کے مابین اشرافیہ کی قبائیں محنت کشوں کے خون سے رنگی ہوئی ہیں۔ عوامی جمہور کی بھڑکتی ہوئی آگ اور قبائے سلطانی سے نفرت کو قیصر ولیم کی زبانی اقبال نے کہا کہ غلامی اور جبریت تو بادشاہت، سلطانیت اور سرمایہ داریت کی اختراع نہیں۔ یہ ایک فطری نفسی چیز ہے جو انسانیت کی فطرت میں قدرت کی طرف سے ڈال دی گئی ہے جو ہمہ مالکوں اور معبودوں کی طاق میں رہتی ہے۔ پیام مشرق کی آخری دو نظمیں " قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" اور " نوائے مزدور "میں انسانیت کی تفریق کو بیان کیا گیا ہے۔ جو خود انسان کی تخلیق کردہ ہے جسے وہ فطرت کا شاخسانہ قرار دیتا ہے۔ جب کھدر پوش مزدور کہتا ہے کہ ہماری جہدِ مسلسل اور انتھک محنت و مشقت کے طفیل سرمایہ دار پشمین قبا زیب تن کرتا ہے۔ ان کے جسم پر لدے لعل و گہر اور موتی و جواہرات ہمارے خون کے قطرے ہیں۔ ہمارے بچوں کی بھوک و پیاس اور ننگے بدن کے آنسو ہیں۔ سرمایہ داروں اور جاگیر داروں اور حکمران اشرافیہ کی قسمت میں آئے ہوئے باغ و بہار دراصل ہماری گریہ سحر اور خونِ جگر سے جنم لیتے ہیں۔

اسی موضوع کو مزید وسعت دیتے ہوئے اقبال اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوری" میں اشتراکیت کے عالمی غلبے کی حقیقت بھی آشکار کرتے ہیں۔ ابلیس جب کہتا ہے کہ اشتراکیت ایک ایسی انقلابی تحریک تھی جو لوگوں کو سرمایہ دار، ملوکیت پرست، فاشزم، آمریت اور سماج کے دیگر جبرانہ ہتھکنڈوں کے خلاف اکساتی ہے۔ یہ مظلوم طبقے، غریبوں اور بے کسوں کی آہ بنتی ہے جبکہ معاشرے کے ظالم اور استحصالی طبقات کی سخت مخالفت کرتی ہے مگر ابلیس تو ایسے نظام کے خلاف رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ تو ابلیسی نظام روا رکھنا چاہتا ہے۔

ے "کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار ، آشفتہ مغز ، آشفتہ ہو"(۱۷)

ابلیس اپنے مشیروں کو اُمید دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ اشتراکی مزدک اور کارل مارکس مستقبل میں ہنگامے برپا نہیں کر سکیں گے کیوں کہ عہد حاضر کی جمہوری سیاست، مادی تصورِ انسان، بادشاہت کی فتنہ سامانیاں، سرمایہ داروں کی بدفعلیاں، فاشزم کی نفرتیں، قومیت و وطن کے لبادے میں لپٹی تقسیم، آمریت کی اخلاق باختہ سوزش ،سامراجیت کے سیاسی ہتھکنڈے اور اشتراکیت کے مادہ پرستانہ اور ملوکانہ منصوبہ جات انسانیت کی عظمت و وقار اور ترقی و کامرانی کی راہ میں حائل ایسی رکاوٹیں ہیں جو وقتی طور پر تو فائدہ مند ہو سکتی ہیں مگر مستقبل میں انسانیت کو پابہ زنجیر کرنے کا سامان ہیں۔ یہ نظام انسان کو مایوسی، ذہنی اضطراب، بے زاری، عدم اطمینان، جنگ و جدال اور کدورت و عداوت میں مبتلا رکھتے ہیں۔ مگر ابلیس اسلام کی عظمت رفتہ کا قائل ہے کیوں کہ اسلام ہی ایک ایسا محرک ہے جو بنی نوع انسان کی آلام و تفکرات کو کم کرنے کا موجب بنتا ہے اور انسان کو آزاد روشن اور فطری بقائے باہمی فراہم کر سکتا ہے۔ اس میں زندگی کے تمام شعبہ جات کے لیے مکمل راہ نمائی پنہاں ہے یہ تغیر و ثبات کا حسین اور حیات آفرین امتزاج ہے۔

اقبال چاہتے ہیں کہ انسان ملوکیت، مارکسیت، اشتراکیت اور مغربی جمہوریت کی مروّجہ بے درد شمعوں میں طواف کرتے ہوئے پروانہ وار سوخت کو اُتار پھینکے اور خودی سے آگاہ ہو کر خود دار اور آزاد روش کو اختیار کرے۔ اقبال کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود جسمانی بلوغت و کامرانی کے ساتھ ساتھ روحانیت کا فروغ بھی ہے۔ جس طرح سے اشتراکیت نے ملوکیت کی طرزِ قدیم کی لغو طرزِ زیست اور اداراجاتی تخریب سے انسان کی آزادی کو چھینا ہے۔ اور جس انداز سے کلیسا کی تنسیخ کی گئی۔ یہ ایک طرح سے درست طرزِ عمل دکھائی دیتا ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے سلطانیت، آمریت اور سرمایہ داریت کو زوال سے ہم کنار ہونا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان خود ساختہ رویوں کی نظامیت نے انسان کو حیوانیت کے درجے سے بھی کم تر کر دیا تھا۔ اقبال کے خیال میں بلاشبہ اشتراکیت ایک عمدہ نظام کی آبیاری کرتا نظر آتا ہے مگر کیا روٹی، کپڑا اور مکان کی آسودگی انسانیت کا مقصود حیات ہو سکتی ہے۔ انسانیت کے مدارج لامتناہی ہیں۔ جن کا مقصد روحانیت کی آزادی کے ساتھ ساتھ داخلی و خارجی معاملات کی آزادی بھی ہے۔ اشتراکیت کی انقلابیت نے ضرور انسانیت کی تعمیر و تخریب میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ صرف مادی جدوجہد تھی جس نے مادی حیات کی کارفرمائیوں کو عادلانہ اقتصادیت سے جوڑ دیا مگر اقبال اس اشتراکی انقلاب کی روح کو اسلام کی روح سے پیوست کرنے کے مشتاق ہیں۔ اس عمل اور طرزِ فکر سے عالمگیر اخوت و مساوات کی شمع فروزاں ہو سکے گی جس کی اساس انسانی اتحاد کی پائیداری اور پختگی پر استوار ہو گی۔ لہٰذا اقبال " اسرارِ خودی" کی تمہید میں اپنا محرک ان اشعار میں بیان کرتے ہیں:

"بہر انسان چشم من شبہا گریست
تا دریدم پردہ اسرار زیست
از درون کار گاہ ممکنات
برکشیدم سر تقویم حیات"(۲۸)

اقبال کی شاعری ایک نئے جہاں نو کی معاشرت کی تشکیل کرتی ہے جس میں اقتدار و دولت ہوس نہ ہو مگر قیصر و لیم کے بقول انسان اقتدار و دولت کی ہوس زمانہ ازل سے رکھتا ہے۔ یہ اقتدار، مال و دولت اور ثروت ایک سحر کاری دلہن کی مانند پُر شکن ہے جس کی بدولت عوام اور سماج کے مفلس افراد پر ظلم و استبداد کی تاریخ رقم کی جاتی ہے۔ اقبال انسان کی آزادی، مساوات اور حقیقی شناخت کا رنگ اُجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ جاوید نامہ میں " جمال الدین افغانی کے نام پیغام" ہو یا "فرمانِ خدا فرشتوں سے" یا پھر " بیداری"، " خودی کی تربیت"، " خودی کی زندگی"، " مرگِ خودی"، " جگنو"، " شمع و پروانہ"، "پیام صبح"، " اسرارِ خودی" اور رموزِ خودی" کی شاہکار نظمیں۔ اقبال ان کے ذریعے ایک ایسے جہانِ نو، ایک ایسے سماج و عمرانی نظام کی تلاش کرتے ہیں جو ذات پات، رنگ و نسل اور رتبہ و مرتبہ کے تمام امتیازات مٹا دے۔ جس معاشرت میں انسانیت کا سچا درد پنہاں ہو۔ جو مادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہ ہو۔ جو غرور کی خدائی کا انکار کرے۔ جس کے قلب میں آگ ابراہیم بسی ہوئی ہو۔ جو افرادِ معاشرت اور اقوام عالم میں صحیح اور طاقتور سیرت و اخلاق اور تہذیب و تمدن کی تجدید کرے۔ اقبال اس بات کا اظہار ڈاکٹر نکلسن کے نام لکھے گئے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

" دراصل اسلام بلکہ کائنات کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسان سے محبت کرتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدودِ ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں

استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جو قومیت کو ملک وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے میں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع انسان کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشوونما وار تقا ہے"(۲۹)

اقبال کا اصل مقصد انسان کی وجودی شناخت اور انفرادیت کو ثابت کرنا ہے۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے "انسان اور بزم قدرت"، "چاند"، "پرندہ اور جگنو"، "سرگزشتہ آدم"، "صبح کا ستارہ"، "عشق اور موت" اور "پروانہ اور جگنو" جیسی نظمیں بھی لکھیں جن میں تمثیلی انداز اپنائے ہوئے انسان کی عظمت اور خودشناسی کی صفات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یوں اس عظمتِ رفتہ میں خودی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ خودی کا کمال یہ ہے کہ انسان اس کی دریافت سے کائنات کے داخلی و خارجی تمام اوصاف و کمالات سے آشکار ہو جاتا ہے۔ جس طرح جگنو خودشناسی کی علامت ہے اور خضر راہ کی مانند راہ نمائی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے۔ اسی سے خودشناسی خودداری، انا اور خود ادائی کا پیش خیمہ بن کر سامنے آتی ہے۔ نظم "شمع و پروانہ" میں جگنو عاشق ہے شمع کا اور روشنی کا طلب گار ہے۔ پروانہ اور جگنو میں فرق صرف حرارت کا ہے کیوں کہ جگنو کے تن بدن سے روشنی جلوہ گیر ہوتی ہے جبکہ پروانے کی تپش اس کے سینے سے بلند ہوتی ہے۔ یوں شمع کا طواف پابجواں قیدی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ یوں ادراک کی قوت اور تحرکِ ذات سے آشنائی "خودی" کو ابھارتی ہے جس سے دنیا کی روح رواں دواں ہے۔ مگر یہ رک جائے تو پروانے کی مانند ایک پل میں موت کی آغوش میں لپٹ جائے۔ خودی کی قوت ایک آتش سیال ہے جو انسان کے وجود میں بالکل ویسے ہی متشکل و مستور ہے جس طرح چنگاری جگنو میں پنہاں ہے۔ یہی چیز انسان میں بھی پائی جاتی ہے اگر وہ اس کا ادراک کرے۔

؎ خودی کیا ہے؟ رازِ درون حیات
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

؎ خودی جلوہ بدست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی بند

؎ حقیقت یہ ہے سینے میں شمع نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

؎ اگر یک سر موئے برتر پَرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

؎ خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

؎ خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مرد ہیچ کارہ نہیں

؎ ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

اقبال کے نزدیک خودی کا فروغ پانا محض فسانہ نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی وصف ہے جس سے کائنات کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے۔ خودی ایک ایسی روشنی ہے جو اگر متحرک ہو جائے تو کائنات اور باطنِ انسانی میں پنہاں اسرار و رموز کو حل کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے اور یہی خودی اقبال کے انسانِ کامل، تصورِ ذات اور مردِ یقین صاحبِ فقر کا ایک خوبرو لباس ہے جو انسان کو "نارِ خودی" اور "نورِ خودی" کے عناصر سے بہرہ واندوز کر دیتا ہے۔ وہ محض ایک صاحب دل خانقاہ نشیں نہیں بلکہ ایک صاحب دل حکمران ہے۔ ایک صاحب دل سالار ہے جس کے سجدوں میں روحِ کائنات جنبش کرتی ہے اور جس کی تلوار شورشِ عالم کا خاتمہ کرتی ہے۔ اقبال کا مردِ کامل اور تصورِ حیات ایک فاتح عالم اور کشور کشا شخصیت ہے جو مادی نقطہ نظر سے قطع تعلق کرتے ہوئے اقطاعِ عالم کا حکمران بن جاتا ہے۔ وہ عالم محسوس کی کشش سے غیر مغلوب ہو کر ابدیت کی زندگی پالیتا ہے۔ وہ کائنات میں نائب خدا کی حیثیت سے فطرت کی قوتوں پر اپنا تسلط قائم کرتا ہے لیکن اس جہاں کے سازوسامان کو اپنا مقصود نہیں بناتا بلکہ اس کو روح کے حق میں گراں بار تصور کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کا نصب العین خدائے لم یزل ہے۔ عالم جہاں کی رنگا رنگی، چہل پہل اور اس کے سازوسامان کی کشش اِسے ہیچ لگتے ہیں۔ فقر و شاہی یا دوسرے الفاظ میں عشق و خودی یا پھر حق باطل کی قوتوں کا امتزاج اقبال کے خیال میں اسلامی فکر، تہذیب اور ذاتِ انسان کی وہ خصوصیات ہیں جو ایک طرف اس کو سکندر، سیزر، نپولین اور ہٹلر جیسے فاتحین سے ممتاز کرتی ہے تو دوسری جانب محض کا اثبات اور قوت کی نفی یا قوت کو نظر انداز کرنے والے راہب اور خانقاہ نشین صوفی سے بھی جدا کرتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

؎ خُسرو شمشیری و درویشی نگاہ
ہر دو گوہر از محیط الٰہ

؎ فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰ است
ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفیٰ است

؎ ایں دو قوت از وجود مومن است
ایں قیام د آن سجود مومن است

اقبال اس خیال کے حامی ہیں کہ شخصیت انسانی کی عظمت و کمال کا حقیقی معیار معجزات کی دنیا میں نہیں بلکہ واقعات کی حقیقی دنیا میں اس کی کرامات و فتوحات ہیں۔ دنیاوی تخیل کی کرامات و غریب ضرور ہیں لیکن دنیائے عمل کرامات کے لیے ایک بہت وسیع میدان بھی فراہم کرتی ہے۔ عمل اور جدوجہد کے نتیجے میں رونما ہونے والے معجزات کا اثر حقیقی، دیرپا اور انقلاب آفریں ہوتا ہے۔ اقبال اپنے عہد کے انسان کو معجزات کی دنیا سے نکال کر واقعات کی حقیقی دنیا میں جلوہ فگن ہوتا دکھاتے ہیں:

؎ تخیلات کی دنیا غریب ہے لیکن
غریب تر ہے حیات و ممات کی دنیا

؎ عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری
بلا رہی تجھے ممکنات کی دنیا

اقبال یقین محکم اور عمل پیہم کے قائل ہیں۔ وہ حالات و واقعات کے مطابق زندگی گزارنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اقبال کا انسان مسجد و خانقاہ میں کمبل اوڑھے بیٹھے تسبیح نہیں پڑھتا بلکہ وہ باہر واقعات کی حقیقی دنیا کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر اسی رنگ میں اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ جبری نظام اور استحصالی قوتوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاتا ہے، نہ کہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر رہبانیت اختیار کرتا ہے۔ اِسی لیے اقبال کہتا ہے:

؎ نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمّتوں کا عالم پیری

اقبال کے تصورِ انسان کی کاملیت اپنی ایمانی قوت، استقلال اور پختہ نصب العین کے طفیل اسے دنیاوی مال وزر سے الگ رکھتے ہوئے آفاقیت کے درجات سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات اور قومیت و وطنیت سے کنارہ کشی کرتے ہوئے ایک "کامل" کی تسخیر کرتا ہے جس کی جڑیں جمی ہوئی ہوں اور اُس کی شاخیں آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہوں۔ وہ دنیا کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ زمانے کی سنگینیوں، مصائب اور حادثات کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ شجاعت، جواں مردی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زندگی کی تاریکیوں میں نوید صبح کا موذن بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کی اذان سے تھکی ہاری غفلت آمیز نیند میں سوئی ہوئی دنیا نشاط اور فرحت آمیز حیات کی طرف لوٹ آتی ہے۔ وہ انسانیت کے مردہ ضمیر کو نئی قوت بخشتی ہے جس سے اس کی اندر اپنے سماج، معاشرت اور فرد کے لیے احساسات درخشندہ ہوتے ہیں جو اس کی فطری آزادی کا منبع و منشا تھے۔ جس آزادی کا تقاضا فطرت اس سے کرتی ہے۔

؎ یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

حوالہ جات

1. Hamburger, Michael, (1969) The truth of Poetry, Britain Richard Clay, The Chaucer Press, P: (39)
2. ٹائن، آرنلڈ جے، (۲۰۰۷ء)، مطالعۂ تاریخ، جلد دوئم، مترجم: مہر غلام رسول، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص: (۳۴)
3. بیگ، ڈاکٹر افتخار، (۲۰۲۲ء)، نئے شعری پیراڈائم اور وجودیت، ملتان، بک ٹائم، ص: (۷)
4. Quigley, carroll, (1979), The Evolution of Civilizations: An Introduction to Historical Analysis, New York, Macmillan Company, page: 153-164
5. روسو، ژاں ژاک، (۱۹۹۸ء)، معاہدہ عمرانی، مترجم: حسین، ڈاکٹر محمود، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ص: (۵۴)
6. اِسر، دیویندر، (۲۰۲۳ء)، فکر اور ادب لاہور، فکشن ہاؤس، ص: (۷۰-۶۹)
7. ممتاز حسین، سید، (۱۹۶۴ء)، نئے تنقیدی گوشے، دلی، آزاد کتاب گھر، ص: (۲۶۴)
8. آغا، ڈاکٹر وزیر، (۱۹۷۰ء)، جدید اردو شاعری_____ ایک مثبت تحریک، مشمولہ: شب خون (رسالہ)، شمارہ: فروری، ص: (۳)
9. انصاری، ڈاکٹر اسلم، (۲۰۱۸ء)، اقبال عہد آفرین، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۲۱)
10. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، کلیاتِ اقبال اُردو، مشمولہ: بانگِ درا، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۲۰۶)
11. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، کلیاتِ اقبال اُردو، مشمولہ: بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۴۹۵)
12. عبداللہ، ڈاکٹر سید، (۱۹۹۹ء) مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ، لاہور، بزم اقبال، ص: (۸۶-۸۵)
13. اقبال، علامہ محمد، (۱۹۹۲ء)، کلیات اقبال فارسی، مشمولہ: جاوید نامہ، مترجم: میاں عبدالرشید، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص: (۸، ۱۲۹، ۱۸، ۷)
14. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، انسان اور بزم کائنات، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی، پاکستان، ص: (۸۷)
15. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہوئے، مشمولہ: کلیات اقبال (بال جبریل)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۴۶۰)
16. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے، مشمولہ: کلیاتِ اقبال (بال جبریل)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۴۶۱-۴۶۰)
17. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، خضر راہ، مشمولہ: کلیاتِ اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۲۸۷)
18. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء) زندگی، مشمولہ: کلیاب اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۲۸۸-۲۸۷)
19. عبدالحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، (۲۰۱۳ء) فکرِ اقبال، لاہور، بزم اقبال، ص: (۱۸۸)
20. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، پنجاب کے دہقان سے، مشمولہ: بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۱۸۷)
21. اقبال، علامہ محمد، (۲۰۰۶ء)، بال جبریل، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ص: (۳۷۷-۳۷۶)
22. اقبال، ڈاکٹر علامہ محمد، (سنہ ندارد)، پیام مشرق، مترجم: ہاشمی، پروفیسر حمید اللہ شاہ، لاہور، مکتبہ دانیال، ص: (۲۱۹)
23. ایضاً، ص: (۲۱۹)
24. ایضاً، ص: (۲۲۰)
25. ایضاً، ص: (۲۲۰)
26. ایضاً، ص: (۲۲۱)
27. اقبال، علامہ محمد، (۱۹۳۸ء)، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، مشمولہ: ارمغانِ مجاز، لاہور، شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار، (۲۲۳)
28. یزدانی، خواجہ حمید، (2002ء)، شرح اسرارِ خودی، لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، ص: (۸۹)
29. ملک، پروفیسر فتح محمد، (۱۹۸۵ء)، اقبال____ فکر و عمل، لاہور، بزمِ اقبال، ص: (۱۷)